تعارف مصنف

ملک بشیر مراد عالمی اردو ادب ایوارڈ یافتہ ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''بے ادبیاں'' ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہے۔ دوسری کتاب ''صفرنامہ'' اپنے شگفتہ اسلوب کے باعث ایک اعلیٰ ادبی فن پارہ ہے جسے علمی و ادبی سطح پر بے حد پزیرائی نصیب ہوئی۔ آپ کے فن اور شخصیت پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ کے تھیسس ہو چکے ہیں۔

آپ کی شگفتہ تحریریں کئی موقر ادبی جرائد کی زینت بن چکی ہیں۔ مزاح نگاری میں آپ کا منفرد اور جداگانہ اسلوب ہے۔ افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، خاکہ نگاری، مزاح نگاری اور شاعری آپ کے خاص تخلیقی میدان ہیں۔ ادب کے علاوہ آپ فنونِ لطیفہ کے کئی اور شعبوں سے وابستہ رہے، ریڈیو اسٹیج، ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے صداکاری، اداکاری اور قلمکاری کے جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے پروڈیوسر اور ٹیلی ویژن کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ وزارتِ ثقافت پاکستان کے ادارے نیشنل کونسل آف آرٹس کے ممبر بورڈ آف گورنرز، آزاد کشمیر ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن میر پور کے لٹریری اینڈ کلچر فورم کے چیئرمین اور سینئر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ ہیں۔

مصنف کی دیگر کتب:

1۔ بے ادبیاں
2۔ صفرنامہ
3۔ خیالات (زیرطبع)
4۔ باقیات (زیرطبع)
5۔ حالات (زیرطبع)

انجمن ترقیٔ اُردو (برطانیہ)
1 College Road, Birmingham, B13 9LS, United Kingdom
E-mail:anjumanturdu@gmail.com

پچوانہ کی جنّت

ملک بشیر مُراد

عالمی امن کے نام

پیش لفظ

ہر کتاب کی اشاعت کے کچھ نہ کچھ مقاصد ضرور ہوتے ہیں جس قدر یہ مقاصد بلند ہوں گے کتاب کی اہمیت اور افادیت اتنی ہی زیادہ ہوگئ۔ زیرِ نظر کتاب بھی بلند مقصد کے پیشِ نظر تحریر کی گئی ہے۔ مصنف نے امن عالم کے اپنے تصور کو پچوانہ کے مثالی معاشرے سے اٹھایا اور پھر اپنی بلند فکری سے اسے ایسی اڑان دی کہ وہ کائنات پر محیط ہوگیا۔ یہ بامقصد سفری روداد اپنے موضوع، تاریخی حقائق اور اسلوبی محاسن کے باعث اتنی اہم ہے کہ ہمارا ادارہ اس کی اشاعت ضروری خیال کرتا ہے۔ یہ جنت نما مثالی معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ایسی شگفتہ تحریر ہے جس کا مقصد بالآخر عالمی امن کا قیام ہے۔ اس دلچسپ اور تاریخی نوعیت کی دستاویز کے مطالعے کے بعد آپ کے دل میں جہاں پچوانہ کے مثالی معاشرے کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوگی وہاں آپ مصنف کے اس خیال سے بھی یقیناً متفق ہوں گے کہ اسی طرز پر اگر ایک عالمی معاشرہ قائم ہو جائے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔

خوش قسمتی سے میں نے پچوانہ کی اس جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اس جنت کا سراپا میں آپ کو ''پچوانہ کی جنت'' کے مصنف اور ریاست جموں وکشمیر کے ممتاز شاعر، ادیب، دانشور اور براڈکاسٹر جناب ملک بشیر مراد کے الفاظ میں آپ کے

سامنے پیش کروں گا۔

''جنت نما یہ بستی ہری بھری اور شاداب ہے۔ یہ ہریالی جنتی مکینوں کی رہینِ منت ہے جو اپنی مدد آپ کے تحت پودے لگاتے ہیں اور ان کی آبیاری کا ثواب دارین کماتے ہیں۔ گویا ایک درخت لگاتے ہیں اور جنت میں گھر بناتے ہیں اور ہر گھر میں پندرہ قسم کے پھل دار درخت اگاتے ہیں۔

مثالی معاشرے کی اس سلطنت میں کوئی بادشاہ ہے نہ رعایا، کوئی راجہ ہے نہ پرجا، کوئی حاکم ہے نہ محکوم، سب آزاد ہیں اور زندگی کا کاروبار کسی انجانے خود کار نظام کے تحت تیز رفتاری سے چل رہا ہے۔ اس برق رفتاری سے واضح ہوتا ہے کہ ہر آدمی نے اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے قبول کر رکھی ہے۔''

ملک بشیر مراد نے پچوانہ کے مثالی معاشرے کے سفر کی رُوداد کو اس خوبصورتی سے لکھا ہے کہ حقیقت پر افسانے کا گمان گزرتا ہے، انہوں نے پچوانہ کے مثالی معاشرے کی کہانی لکھتے لکھتے علاقہ اندر ہل کی مقامی تاریخ سے لے کر جموں و کشمیر کی قومی تاریخ اور پھر برصغیر کی تاریخ سے لے عالمی تاریخ اور علاقہ اندر ہل کے لوگوں کی جدوجہد، قربانیوں اور کامیابیوں کی کہانی کو اس خوبصورتی سے لکھا ہے کہ یہ کتاب ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ کی ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

پچوانہ کے مثالی معاشرے کی تعمیر کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ملک بشیر مراد لکھتے ہیں:

> ''اس جنت کی آبادکاری کی جانکاری ہمارے خضر راہ امتیاز حسین راجہ کے من میں سمائی، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی بغیر نظریے کے ایسے ہی ہے جیسے بنا تیل کے چراغ اور وہ لوگوں کو

اس بات پر مائل کر رہے ہیں کہ علم صرف کتابیں رٹنے کا نام نہیں
بلکہ اس مہارت اور تکنیک کا نام ہے جس کی بدولت جنت سے نکالا
ہوا آدم زمین پر دوبارہ ایک نئی جنت تعمیر کرے، چنانچہ انہوں نے
اپنی جانکاری کے اس منصوبے کی مزید گل کاری کی خاطر اہلِ پچوانہ
کی ایک محفل سجائی اور ان کے سامنے مثالی معاشرے کی تجویز رکھ
دی۔"

تمام اہلِ پچوانہ نے لبیک کہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کر دیں اور اب آہستہ آہستہ پچوانہ کی جنت کے خدوخال واضح ہو رہے ہیں اور انہی خدوخال کو ملک بشیر مراد نے اپنی تصنیف ''پچوانہ کی جنت'' میں بیان کیا ہے۔

پچوانہ کے اس مثالی معاشرے کے بانی محرک اور متحرک شخصیت امتیاز حسین راجہ ایڈووکیٹ سے دوستی تین عشروں سے کچھ زیادہ پر محیط ہے۔ ہمارا طالبِ علمی کا زمانہ تاریخ کشمیر کا ایک ہنگامہ خیز دور تھا، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور وادیِ کشمیر سے اُٹھنے والی آزادی کی توانا آواز نے خطے کو ہلا کر اور ریاست جموں و کشمیر کو گرما کر رکھ دیا تھا۔ زمانۂ طالبِ علمی خواب دیکھنے کا زمانہ ہوتا ہے اور ہم تاریخ سے ناواقف، تحریک کے تقاضوں سے ناآشنا، واعظ کی چالوں اور رہبروں کی چالاکیوں سے بے خبر اس نعرے سے متاثر ہو کر کہ ''اس سال کا نعرۂ آزادی'' اپنی آنکھوں میں آزادی کا خواب سجائے سوتے جاگتے آزادی کے منتظر تھے اور پورے یقین اور ایمانداری سے سمجھتے تھے کہ اب آزادی کی منزل چند گام کے ہی فاصلے پہ ہے!

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

کہیں تو ہو گا شب ست موج کا ساحل
کہیں تو رکے گا سفینۂ غم کا دل

''زمانۂ طالبِ علمی میں میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن" کا جو خواب دیکھا تھا وہ تو پورا نہ ہوا البتہ اس جنت کی تلاش میں چلتے چلتے امتیاز حسین راجہ نے اپنے گاؤں میں ایک جنت تعمیر کرنے کی ٹھان لی اور اسی جنت کی رُوداد ''پچوانہ کی جنت" کی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ فکشن کے تمام رنگوں سے مزین ایک حقیقی رُوداد پڑھیں اور میں اپنی بات اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ کرے کہ پچوانہ کے مثالی معاشرے کی تحریک اندر ہل کے اس چھوٹے سے خوبصورت گاؤں سے نکل کر پورے عالم میں پھیل جائے۔ آمین

ساجد یوسف

صدر

انجمن ترقی اردو برمنگھم برطانیہ

پچوانہ کی جنت

دِلکشا منگلا جھیل کے اُس پار سرسبز و شاداب وادی اندر ہل کے مہکتے سمن زار میں چہار سُو بازگشت کرتی ایک خوشگوار خبر فضائی حدود و قیود عبور کر کے کسی پرہیز گار مومن کی زبانی آخر کار ہماری گناہگار سماعتوں سے بھی آن ٹکرائی کہ ڈڈیال کے مضافات کی کسی خوش نما بستی میں کہیں جنت نما معاشرہ آباد ہوا چاہتا ہے۔ اس پُر جمال خوش خبری کی شنید سے جہاں دید کی تمنا نے پُر جلال انگڑائی لی، وہاں اپنی بے خبری پر ملال بھی ہوا کہ نوزائیدہ جنت کے قرب وجوار میں رہائش پذیر ہوتے ہوئے بھی ہنوز اس کے قرب کی لذت سے ناآشنا ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بندۂ مومن جنت کا ہمسایہ ہو اور وہ ذوقِ دیدار اور ہمسائیگی کے خمار میں گرفتار ہو کے اس پہ یلغار نہ کرے۔

پس ایک شب انہی بشری کمزوریوں کی زد میں آئے، عالمِ وجد میں یورش کی نیت باندھی اور اگلی صبح سویرے، منہ اندھیرے کوچ کا نقارہ بجاتے، دندناتے، گنگناتے موعودہ جنتِ ارضی کی تلاش میں نکل پڑے۔

جنّت کی طلبگاری کی سرشاری فقط ہم پہ ہی طاری نہیں بلکہ جملہ معززین بشمول مؤمنین اس کی تیاری باقاعدہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جب سے حضرت آدمؑ کا جنت سے انخلا ہوا تب سے ابن آدم جنت میں دوبارہ داخلے کے درپے ہے۔ جنت کا تصوّر لگ بھگ

تمام مذاہب میں موجود ہے تاہم ان کا ناک نقشہ اور داخلے کے لیے شرائط الگ الگ ہیں۔

انسانی تاریخ کے اولین دور کی اگر دور بین سے چھان بین کی جائے تو قبل مسیح زرتشت المعروف زرد ُشت کے ہاں بہشت کی موہوم سی شکل اُبھرتی نظر آتی ہے۔ جس کے پیروکار آگ کا الاؤ روشن کیے ابھی تک دشت وصحرا میں بہشت کے متلاشی ہیں، لیکن مومنین کا عقیدہ ہے کہ:

جنت کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی!

الغرض آتش پرستوں کی بہشت ، مہ پرستوں کا ہیون اور بُت پرستوں کا سورگ ایک جیسے مقام برائے دائمی قیام وآرام ہیں، لیکن سب سے زیادہ حسیں، دل نشیں، کیف آفریں، دل کش، دل آویز اور مقدس سرزمیں ہم حق پرستوں کی جنتِ بریں ہے۔ جس کی زیبائی، رعنائی اور دلربائی کا بیاں مقصود ہو تو فرشتوں کی زباں مطلوب ہے۔

ہمارے ناقص گماں میں اس ابدی جہاں کا جو اجمالی خاکہ اُبھرتا ہے، اس کے مطابق یہ ایک ایسا گوشۂ عافیت ہے جہاں ہر سمت اور ہمہ وقت امنِ عامہ کی صورت حال پُر امن و پُرسکون ہے۔ جنت کا ہر مکیں صادق وامیں، خندہ جبیں، اس فردوسِ بریں کے نور آفریں ماحول میں برابری کی بنیادوں پر آسائشوں سے بہرہ مند ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک ایسا روحانی معاشرہ ہے جہاں حضرت انساں اپنی حیوانی جبلّتوں کے برخلاف رحمانی سرشت کے پُرنور کیف میں باہمی محبت و یگانگت کے ابدی لطف وسرُ ور سے ہمکنار ہو۔ ایک ایسا قریۂ شاداب جہاں غموں کی بادِسموم کے بجائے مسرتوں کی جاں فزا پُروا چلتی ہو۔ ایک ایسا مہکتا باغِ عدن جہاں نفرتوں کے ببول نہیں، محبتوں کے پھول کھلتے ہوں۔ یہ تصوّر اتنا خوش کُن ہے کہ ہر فرزانہ بقائمی ہوش وحواسِ خمسہ اس کا دیوانہ ہے۔ وہ کسی نہ کسی طور اس بستی کی جانب مراجعت چاہتا ہے ، جہاں سے اپنی بھول چوک کے باعث بیدخل

کیا گیا۔ہم سمیت جملہ بندگانِ خدا اس دلنشیں ماحول کے جاں آفریں کیف سے مغلوب ہیں اوراس پہ غلبہ پانے کے لئے اپنے اپنے قرینے سے محوِ جہاد ہیں۔لیکن حضرتِ انساں کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس عارضی دُنیا کو بھی ارضی جنت بنایا جاسکتا ہے۔

تاریخی مخبری کے طفیل ہمیں شدّاد اور حسن بن صباح کی جنت کا ذکرِ خیر تو ملتا ہے لیکن اس کے پس منظر میں شر کے شرارے بھی شعلہ فشاں نظر آتے ہیں۔ان بے ثبات حرکات کے پس منظر میں فتنہ و فسادات کے محرکات کے علاوہ ہر دو کے نفسیاتی مسائل اور ذاتی مقاصد پوشیدہ تھے جبکہ خدائی جنت سے بنی آدم کے اجتماعی مفادات اور انسانی فلاح کی برکات ہویدا ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور یہ ربِ کائنات کی جانب سے ایک انعام ہے جو وہ صالح اعمال کے عوض اپنی نیک مخلوق کو عطا فرماتا ہے۔

انسانی تاریخ کی مزید سراغ رسانی کی جائے تو دو اور بندوں کا سراغ بھی ملتا ہے جنہوں نے جنت نما معاشرے کا تصور پیش کیا لیکن تا زیست اپنے غیر جامع تصورات کو عملی پاجامہ نہیں پہنا سکے۔ان میں اوّل یونانی فلسفی افلاطون تھا جس نے اپنی کتاب ''رِی پبلک'' میں ''پبلک'' کے لئے مثالی معاشرے کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا۔اس کی یہ جنت تمام عملی بندوں کے لیے تھی سوائے بے چارے شاعر کے جسے اِس حواس باختہ فلسفی نے اپنی خود ساختہ خیالی ریاست سے باہر دھکیل دیا تھا۔

دوئم ''تھامس مور'' جس نے یونانی فلسفی کے اس تصوّر پہ ''ڈومور'' کے طور پر اپنی کتاب ''یوٹوپیا'' میں ایک خیالی معاشرے کا ایسا خواب پیش کیا جو کم و بیش جنت کا نعم البدل تھا لیکن وہ بھی اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نہ دیکھ پایا۔اگر آج ہر دو زندہ ہوتے تو نہ صرف شرمندہ ہوتے بلکہ ہمارے ہمسفر بھی ہوتے لیکن فی الوقت ہم تین مومنین ایک مختصر ترین قافلے کی صورت جنت کی راہ میں ہیں۔

ہم میں ایک چھیاسی سالہ شعلہ جوالہ نو جواں بزرگ اسلم لون ہیں۔ جو صحافت اور ادب میں بیک وقت پکڑ رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ بزرگوار بسلسلۂ روزگار ڈڈیال سے برطانیہ روانہ ہوئے لیکن وطن کی محبت کی اسیری کی دلگیری ساتھ لے گئے۔ اُنہی اسیری کے دنوں میں انھوں نے ''کشمیر ڈائجسٹ'' شائع کیا جسے قارئین ''ڈائجسٹ'' نہیں کر سکے۔ پس قوم کو مزید بدہضمی سے بچانے کے لیے رسالہ بند کیا اور برطانیہ کے ہی پابند ہو کر رہ گئے۔ موصوف اس کہولت میں بھی نہایت سہولت سے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کے یوگا کی ایسی خوفناک ورزشیں رچاتے ہیں کہ جغادری یوگی بھی گھبرا جائیں۔ وہ محلے میں نوجوانوں سے شرط باندھ کے دوڑ لگاتے ہیں اور جیت بھی جاتے ہیں، اس عمر میں جہاں بزرگ لوگ بستر پر استراحت پذیر، فرشتۂ اجل کا انتظار فرماتے ہیں، وہاں لون صاحب نہ صرف خود پیہم سفر میں رقصاں رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ہم سفری کی زچگیوں پر اُکساتے رہتے ہیں۔ ایسے بزرگوں کے بارے میں غالبؔ نے پیشگی ارشاد فرما کر دُنیا سے بروقت پردہ فرمایا تھا کہ:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

لیکن ہم ان بزرگ ہمسفر کے ہوتے ہوئے بھی ایک عدد اضافی خضر کی پیروی پر مجبورِ محض تھے کہ آبِ حیات کی طرح اس جنت نما وادی کی خبر بھی فقط ہمارے خضرِ راہ امتیاز حسین راجہ کو تھی۔ وہ ظاہری اور قانونی طور طریقے سے ہمہ وقتی قانون دان اور فی الوقتی صدر بار ایسوسی ایشن میر پور ہیں لیکن باطنی اور روحانی سلیقے اور قرینے سے ایک دانشور اور علم و ادب سے گہرا اور سنہرا تعلق رکھنے والے چالیس سالہ بزرگ ہیں۔ یہ بزرگی جسمانی نہیں بلکہ ذہنی و روحانی ہے۔ وہ اس جنت کی تشکیل کے محرک ہیں اور تا دمِ تکمیل متحرک

رہنے کا عہد بھی کر چکے ہیں۔ جنت کی راہ میں انہوں نے ہمیں اپنی دانش مندانہ گفتگو سے خضر کی مانند ذہنی بہلاوے میں مبتلا رکھا۔ ہماری اوقات ہی کیا ،سکندر جیسے ہوش مند بادشاہ بھی خضر کے بہکاوے میں آ کے بے ہوش ہو گئے تھے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

ارضی جنت کے سفر میں ہمارا پہلا پڑاؤ ڈڈیال ہے، جو علاقہ اندرہل کا مرکزی مقام ہے۔ اندرہل کی وجہ تسمیہ قصہ گو قسم کے بزرگان نے قسمیہ طور پر یہ بیان فرمائی ہے کہ عہدِ انگلیشیہ میں یہاں سے کوئی انگریز گھومتا گھامتا گزرا اور پہاڑ کے دامن میں آباد اس بستی کا محلِ وقوع دیکھ کر جوشِ آوارگی میں ''انڈرہل'' Under hill چلّا اُٹھا، مطلب کہ ''پہاڑ کے نیچے'' گویا:

اس درجہ مستند ہے انگریز کا فرمایا ہوا

کہ اِدھر حاکم انگریز نے عالمِ مدہوشی میں یک بارگی انڈرہل کہا تو اُدھر محکوم رعایا نے من وعن دیوانہ وار لبیک کہہ کے تسلیم کیا اور یہی ''انڈرہل'' امتدادِ زمانہ کے ساتھ بگڑتے ہوئے اندرہل یا اندرال کا علاقہ کہلایا۔ جس طرح ''واہ'' شہر کے بارے میں روایت ہے کہ شہنشاہ جہانگیر جب کشمیر کی سیاحتی مہم پہ تھا تو وہ ''جلال سر'' نامی گاؤں سے گزرا تو اس کی شادابی اور ہریالی پر لٹو ہو گیا اور منہ سے بے اختیار نکلا ''واہ'' بس پھر کیا تھا ''جلال سر'' ایک دم ''واہ'' بن گیا۔ پھر جب یہاں اسلحہ فیکٹری قائم ہوئی تو یہ واہ فیکٹری کا علاقہ قرار پایا اور جب یہاں فوجی چھاؤنی معرضِ وجود میں آئی تو ''واہ کینٹ'' کہلایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا پہلا معلوم نام ''جلال سر'' شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنے نام پہ رکھا ہو کہ مغلیہ عہد میں مقامات کے نام بادشاہوں کے نام پر بدلنے کا فتنہ سرِ عام ہوتا تھا۔ وزیر،

مشیر بھی موقع پا کر اس دوڑ میں حسب توفیق اپنے گھوڑے دوڑا لیتے تھے۔

واہ کینٹ سے ہزارہ کی جانب جاتے ہوئے ایک دلکش شہر مانسہرہ آتا ہے۔ درباری راوی فرماتے ہیں کہ یہ اکبر کے رتن اور جہانگیر کے برادرِ نسبتی و مشیرِ خاص مان سنگھ کے نام پر ''مان سر'' رکھا گیا تھا، جب کہ ریکارڈ مال کی گواہی ہے کہ یہ ''مہا سر'' تھا جسے مہا سنگھ میر پوری نے آباد کیا، تاریخ کے کھوجیوں کی کھوج کے مطابق یہ سب کچھ نہیں تھا بلکہ یہاں ایک بڑی جھیل تھی جس کی نسبت سے اس کا نام ''مہان سر'' پڑ گیا۔ دروغ گفتن برگردن راوی، مانسہرہ اور کشمیر کو جدا کرنے والے دریائے کنہار کے بارے میں بھی یہ زنانہ سی روایت ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کی پیاری، راج دلاری بیگم نور جہاں نے آشوبِ چشم سے ماری اپنی آنکھوں کو اس کے پانی سے غسلِ صحت دیا تو بیماری بھاگ کھڑی ہوئی اور دریا کے بھاگ جاگ اٹھے کہ اُس نے اتنی سی بات پر دریا کا نام ''نین سکھ'' رکھ دیا یعنی آنکھوں کا چین۔۔۔ یہ مغلیہ دربار کے راوی تھے جو سب چین ہی چین لکھتے تھے تا کہ باشاہ سلامت بے چین نہ ہوں۔

مفتوحہ علاقوں کے نام بدلنے کی دہشت گردی فقط مغلوں نے ہی نہیں کی، ہر فاتح کرتا ہے۔ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح ہند میں نازل ہونے والے آرین نے دراوڑوں کے ساتھ اور دراوڑوں نے یہی غنڈہ گردی مُنڈا قبائل کے ساتھ روا رکھی۔ پس آزادی سے پیشتر ہمارے بیشتر علاقوں کے نام ہندی زبان میں تھے جو سنسکرت اور دراوڑی کا ملغوبہ ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے ان میں سے اکثر ہندوانہ ناموں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی سعادت سمیٹی۔

اِن تاریخی حوالوں سے اُبھرنے والے سوالوں کے برتے پر ہمیں ذاتی طور پر ''انڈر ہل'' کی کہانی سے اتفاق نہیں اور اب ہم اس کی جو توجیہ پیش کرنے کی جسارت

کے مرتکب ہو رہے ہیں، اس سے آپ کا متفق علیہ ہونا بھی ہرگز، ہرگز ضروری نہیں ہے۔ اتفاق اچھی شے ہے لیکن اس میں ایک برائی بھی پوشیدہ ہے کہ اس سے تحقیق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔اس کے برعکس اختلاف بُری شے سہی، لیکن اس میں ایک اچھائی بھی خوابیدہ ہے کہ یہ تجسّس وجستجو کے کئی روزن کھولتی ہے۔ہم بھی ایک دریچہ فقط اس نیک نیتی سے واء کیے دیتے ہیں کہ آپ اس سے جھانک کر یہ کھوج لگائیں کہ واقعی ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' یا یہ محض علامہ اقبالؒ کا خیال ہی تھا۔

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ جب اس علاقے کو اندرہل یا اندرال کہا جاتا تھا، اُس وقت انگریز پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور اگر خدانخواستہ کہیں پیدا ہوا بھی تھا تو اہلِ ہند کو اس کی پیدائش کی خبر نہیں تھی۔روایتی کہانیوں کی اگر ذرا سی مزاحمت اور تحقیق کی تھوڑی سی زحمت کی جائے تو ہندو متھالوجی میں ''راجہ اِندر'' کا ذکر ملتا ہے۔''اِندر'' مبینہ طور پر ہندی آریاؤں کے دیوتاؤں کا مہان دیوتا مانا جاتا ہے، جس کے دربار میں ان گنت بے کار مشیر و وزیر بیک وقت جے جے کار کرتے اور بے شمار گلنار، سُندر الپسرائیں ہمہ وقت فتنہ و فجور اور رقص کے سرور میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ اسی طرح ایک ''اندرا دیوی'' بھی تھی جو ان کے بقول لکشمی کے روپ میں ہُن برسانے کے کام پر مامور تھی۔

ان ناموں سے منسوب قبیلوں کے علاوہ علاقے بھی تھے۔ اس کی بڑی مثال ہندوستان کا بڑا شہر دہلی ہے جس کا پرانا نام ''اندر پرستھ'' تھا، پھر وقت کے ساتھ دہلی اور اب دِلی ہو چکا ہے۔اس طرح دیوتاؤں کے ناموں سے موسوم قبیلے اور قبیلوں کے ناموں سے موسوم علاقے موجود ہیں جیسے چندرال، پسوال، دھمیال، کلیال، بنگیال، نگیال اور تھوتھال وغیرہ ایسے ہی اندرال بھی ہے۔جس کا بگاڑ ''اندرہل'' بھی ہوسکتا ہے کیونکہ لفظ بھی وقت کے ساتھ لہجے اور شکلیں تبدیل کرتے ہیں۔

مختلف علاقوں میں ڈڈیال نام کے کئی قصبے اور گاؤں ہیں۔ چکوال اور مانسہرہ میں ڈڈیال نام کے گاؤں (جو ہماری سفری دہشت گردی کی زد میں آ چکے ہیں۔) علاقائی لہجے کی ہلکی سی اضافت کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ایک جگہ بے چارے ڈڈیال کو زیر لگا کر زیر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ پیش لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔ الغرض لفظ لہجوں کے بدلاؤ کے ساتھ شکلیں بدلتے ہیں۔ ہمارا تو یہ خیال بھی اپنے اندر اچھا خاصا منطقی احتمال رکھتا ہے کہ نیلم ویلی کا گاؤں دُدھنیال بھی ڈڈیال ہے یا پھر ڈڈیال بھی دُدھنیال ہے۔ ددال نام کا ایک قبیلہ بھی ہزارے میں موجود ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ ڈڈیال ''ددال'' ہو، جس طرح الفاظ لہجوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اسی طرح قبائل بھی وقت کی غارت گری میں معدوم ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا بھی شدید خدشہ ہے کہ ہمارا یہ خیالِ خام بھی تحقیق کے بعد کہیں دوام نہ پا جائے کہ ڈڈیال کا نام کسی گمنام قبیلے کے ان مقامات پر مقیم ہونے کی گواہی ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ ''تاریخ داں'' کے لیے!

الحمدللہ ہم تاریخ داں نہیں، سادہ سے مسلماں ہیں اس لیے تاریخ دانی کا دعویٰ قطعاً نہیں کرتے اور شکر ہے کہ تاریخ داں نہیں ہیں جسے عربی میں مؤرّخ اور ہندی بھاشا میں لہجے کی لطافت کے باعث مُورکھ کہا جاتا ہے۔خیر یہ طوالت آمیز بحث ہے جو روا روی میں جنت کی راہ میں آ پڑی گویا:

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات!

لیکن ابھی مقطع کہاں؟ ہنوز مطلع ہی اٹکا پڑا ہے۔ اِدھر مسافرانِ جنت مطلوبہ ارضی جنت کی راہ میں حائل بھول بھلیوں اور غلام گردشوں میں محوِ گردش ہیں تو اُدھر کہیں دور سے دم بہ دم صدا آ رہی ہے کہ:

جنت اتنی آسانی اور اس قدر بے سرو سامانی کی حالت میں کہاں ہاتھ آتی ہے؟ اس مسافت کو طے کرنے کے لئے عمر بھر کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا کامل اِدراک رکھتے ہوئے بھی ہم کسی بے صبرے زاہد کی مانند بعجلت تمام جنتِ ارضی میں داخل ہو کے فرضی ثواب کمانے اور عیش و نشاط کے لطف اُٹھانے کے چکر میں تھے لیکن شاید ہمارے ہم سفر راجہ جی کو ابھی ہمارے ایمان کی مزید آزمائش مطلوب ہے۔

فی الوقت ہمیں اللہ کے ایک نیک بندے سے ملنا مقصود ہے جو اہلِ ایمان کو جنت میں داخل ہونے کی ریہرسل کرواتے ہیں۔ ان کے نزدیک رشوت، ناانصافی اور ظلم سے پاک ہوئے بغیر جنت کا ٹکٹ نہیں مل سکتا۔ وہ ''صدائے حق'' کا پرچم تھامے، متوقع جنتیوں کو جنت کی عملی تربیت بہم پہنچانے میں پیہم مصروف ہیں۔ یہ خواجہ افتخار ہیں جو ابھی تک بہت سے رشوت خوروں اور حرام خوروں کو توبہ کی ٹکٹکی پہ چڑھا کر حلال خوروں اور سبزی خوروں کی صف میں بالجبر شامل کر چکے ہیں یعنی کہ جبری بنیادوں پر جنت کی راہ دکھا چکے ہیں۔ یہ پیشگی ریہرسل آزاد ریاست کے پورے خطے کے مکینوں کی ضرورت ہے۔ خطہ بھی کتنا ہے صبح گجر دم نکلیں تو رات ڈھلے سفر تمام ہو جاتا ہے۔ نااہلِ اقتدار اس مختصر سی ریاست کو اہلِ پچوانہ کے مثالی معاشرہ کی صورت مثالی ریاست کیوں نہیں بنا سکتے؟ بنا تو سکتے ہیں لیکن بناتے نہیں کیونکہ اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ اور محنت طلب کام اقتدار کے وقار کے منافی ہے۔

نام اور کام کی مماثلت اور نوعیت کے اعتبار سے خواجہ افتخار اور راجہ امتیاز دونوں خضر کا کردار ادا کر رہے ہیں اگر کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو تو اوّل الذکر کو خواجہ خضر آخر الذکر کو بلا توقف راجہ خضر کہا جا سکتا ہے! فقط یہی ملاقات جنت کی راہ میں حائل

نہیں تھی بلکہ:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

اب ہمارے راجہ خضر ایک علمی استھان میں "راجہ اندر" کی طرح کرسیٔ صدارت پر براجمان ہیں۔ گویا کرسیٔ صدارت اُن کے تعاقب میں ایسے پڑی ہوئی ہے جیسے اہلِ سیاست کرسیٔ اقتدار کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں۔ اِدھر ہم بھی بمع اسلم لون جی خواہ مخواہ مہمان خصوصی کی نشستوں پر جبری بھرتی کر دیے گئے۔

یہ ملت کالج ہے جس کی انتظامیہ ملت کی خدمت اور محنت کے جذبے پہ یقینِ محکم رکھتی ہے۔ بچوں اور اساتذہ نے اپنی فنی مہارت کا بھرپور جلوہ دکھایا۔ جنہیں ناظرین نے حتی المقدور تالیاں پیٹ کر سراہا۔ ہم نے بھی بے قصور سامعین کو اپنا طویل بھاشن سنایا اور تڑپایا۔ آخر میں صدرِ محفل نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا، منجملہ خطبات کا ملا جلا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ہم اُن کی عملی کارکردگی اور وہ ہماری دِلی ہمدردی سے مطمئن ہیں مزید اطمینان اٰمّابعد برادرانِ ملت کی جانب سے پیش کردہ پُرتکلف ضیافت اور بے تکلف گفتگو سے حاصل کیا گیا اور تازہ دم ہو کے جنت کی طرف لپک پڑے۔

ڈڈیال میر پور کی خوشحالی کا آئینہ دار ہے۔ اہلِ اندر ہل نے نہ صرف وطن کی معیشت کے استحکام کا انتظام اور اہلِ میر پور کی برطانیہ منتقلی کا انصرام کیا بلکہ انگریز سے بے تحاشہ انتقام بھی لیا۔ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو ڈڈیال کے غیوروں نے جواباً انگلستان پر ہلہ بول دیا۔ آزادی کے بعد تو مفرور غنیم کا باقاعدہ جتھوں کی صورت میں پیچھا کیا نوبت بایں جا رسید کہ اب پرانے گورے لگ بھگ جہنم رسید ہو چکے ہیں اور باقی ماندہ انگریزی نسل شہروں سے بیدخل کر کے مضافات میں مقید کر دی گئی ہے۔ یہی جذبۂ جہاد قائم رہا تو انگلستان سے انگریزوں کے ناپید ہونے کے قوی امکانات روشن ہیں۔

میرپور ڈویژن میں جتنی تعمیر و ترقی نظر آتی ہے اس کا سہرا بھی دیارِ غیر میں بسنے والے انہی اپنوں کے سر ہے۔ انھوں نے جو کچھ کمایا، اپنی زمین پہ لگایا۔ یہاں محل نما مکانات تعمیر کیے اور خود برطانیہ میں چھوٹے چھوٹے گھروں میں مقیم رہے۔ یہاں کے محلات میں جو بادشاہ لوگ رہتے ہیں وہ رہنے کے بھی پیسے لیتے ہیں۔ ان معزز ین قابضین سے اب ان محلات کا قبضہ واگزار کرنے کے لیے اتنی ہی جدوجہد کرنی پڑے گی جتنا تحریکِ پاکستان میں ہمارے عمائدین کو کرنی پڑی لیکن مسئلہ یہ درپیش ہے کہ برطانیہ میں پروان چڑھنے والی نسل کے پاس اتنی طویل تحریک چلانے کا وقت نہیں۔

بنیادی طور پر یہاں کے لوگ سادہ مزاج، نیک دل اور اعلیٰ ظرف ہیں۔ دستور زمانہ ہے کہ کسی کے ہاتھ جب کوئی خزانہ لگ جائے۔ اس کا ٹھکانہ بتانا تو دُور کی بات وہ دوسروں کو اس کی ہَوا بھی نہیں لگنے دیتا لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ ہو کہ آزادی سے قبل بحری جہازوں پر جب یہ محنت کش برطانیہ کی بندرگاہ پر اُترتے ہیں تو طارق بن زیاد کی طرح کشتیاں نہیں جلاتے بلکہ اپنے ہم وطنوں کے لئے راستے کھولنے کی راہ نکالتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ان کے ذاتی بچے برطانیہ چلے گئے بلکہ وہ دوسری ذاتوں کے غریب بچوں کو بھی راتوں رات اپنے بچے بنا کر برطانیہ لے جاتے رہے ہیں۔ ان کی یہی فراخدلی بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی اور خوشحالی ان کی نسلوں کا مقدّر ٹھہری۔ ہمارے نزدیک تو خوشحالی کے گل پات کھلنے کی وجہ بیرونِ ملک لوگوں کی محنت اور میاں محمد بخشؒ کی اس دُعا کا نتیجہ ہے:

رحمت دا مینہ پا خدایا باغ سُکاّ کر ہریا
بوٹا آس اُمید مری دا کر دے میوے بھریا

یہاں کے لوگوں کا ایک اور وصف بھی لائقِ تحسین ہے کہ وہ اپنی مٹی سے نہایت محبت کرتے ہیں اور اس سے جُڑے رہنے میں عظمت محسوس کرتے ہیں۔ ولایت کی

تہذیبی قباحتیں بھی ان کے دل و دماغ سے اپنی تہذیب وثقافت کی قوسِ قزح ماند نہیں کر پائی۔ نصف صدی بعد بھی ''بوٹا جی'' تہبند باندھے، ولایت سے یوں وارد ہوتے ہیں جیسے اگلے گاؤں کھیتی باڑی کرنے گئے تھے۔ لیکن قسمت دیکھیے کہ یہ محبت وہ برطانیہ میں پیدا ہونے والی اپنی اگلی نسل میں منتقل نہیں کر پائے۔ انھیں یہاں کا ماحول ناہموار، قانون بے اعتبار، نظام ناپائیدار اور لوگ خونخوار لگتے ہیں، چنانچہ وہ اس دھواں دھار ماحول میں آنے سے ڈرتے ہیں جہاں محبت وخلوص کی رمق کم اور لالچ وحرص کی چمک زیادہ ہوچکی ہے۔ اور اگر یہی حالت رہی تو عین ممکن ہے کہ اِن بچوں کے بچے اپنے سوفی صد انگریز بچوں کو یہ کہانی سنائیں کہ ہمارے اجداد کسی اجنبی ملک سے آئے تھے اور عجیب سی زبان بولتے تھے۔ اس المیے سے بچنے کے لیے موجودہ نسل اور ہماری ریاست کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ اربابِ اختیار کو خوابِ غفلت سے انگڑائی لینی ہوگی اور غور وخوض کے حوض میں ڈوب کر سوچنا ہوگا کہ اگر وہ نہیں آئے تو زرِ مبادلہ کہاں سے آئے گا اور آپ کس کے سپانسر پر برطانیہ کا دورہ فرمائیں گے۔

جہاں ڈڈیال کے جری اور جفاکش لوگوں نے ملکی معاشی خوش حالی میں ہراول دستے کا کام کیا وہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی نام پیدا کیا۔ بیشتر سیاسی اور سماجی شعور کی تحاریک یہیں سے اُبھریں۔ اس مٹی کے خمیر سے ہمہ گیر شخصیات نے نمو پائی۔

جناب عبدالخالق انصاری ایک ایسے نظریاتی محاذ کے خالق تھے جس نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں برسرِ پیکار سرفروشوں کو حرّیتِ فکر کی نئی رزم گاہوں کی راہ دکھائی۔ پیر علی جان شاہ جنھوں نے بارِ اوّل ایک پاکستانی سیاسی جماعت کی بنیاد کشمیر میں رکھ کے سیاست میں ایک نئی جان ڈالی۔ جسٹس عبدالمجید ملک ایسے سیاست دان، قانون دان اور خوش بیان منصف، جو شش جہات کامرانیوں کے جھنڈے گاڑھتے اور دُنیا کے

گلستان میں اپنے فکری پھول کھلاتے اس سرزمین کی پہچان بن گئے۔جسٹس محمد شیراز خان کیانی ایسے عادل منصف، جن کے باطن میں ایک شاعر بھی اپنی آب وتاب دکھانے مچلتا رہا لیکن منصب مانع رہا۔زندگی مہلت دیتی تو وہ انصاف کے ساتھ شعروسخن کی تب وتابِ جاودانہ دکھاتے۔اور پھر سورکھی کے درویش منش، خوش اخلاق، منصف مزاج یونس سرکھوی، جن کی زندگی انسانی محبت سے عبارت تھی۔مشاہدہ عام ہے کہ عام سے بندے کو عام سا عہدہ مل جائے تو وہ بندہ نہیں رہتا، افسر بن جاتا ہے اور بلاوجہ مردم بیزار نظر آتا ہے لیکن سرکھوی صاحب عدالتِ عظمیٰ کے چیف جسٹس بن کے بھی انسان دوست رہے۔

محمود ہاشمی ایسے اعلیٰ پایہ ادیب اور تنقید نگار جنہوں نے جوانی میں ’’کشمیر اُداس ہے‘‘ جیسا منفرد اور جداگانہ رپورتاژ لکھ کر رفیقوں کو خوش اور رقیبوں کو خفا کیا اور بڑھاپے میں انگریزوں کو اُردُو کا قاعدہ پڑھا کر باقاعدہ زبانی کلامی مسلمان بھی کیا۔ملحقہ گاؤں سیاکھ سے مولانا محمد عبداللہ سیاکھویؒ بھی اپنے عہد کے جیّد عالم ہوگزرے ہیں جنہوں نے آزادیٔ افکار کی تعلیم دی اور اِدھر ہی ’’ڈھوک مولوی ڈنڈا‘‘ سے اُبھرنے والے مولوی عبدالغنی نے اسلامی تعلیمات کو ڈنڈے کے زور پر نافذ کرنے کی بھرپور سعی کی۔

یہیں کھنیارہ شریف کی بستی سے شہنشاہ ظرافت سید ضمیر جعفری کی ننھیالی نسبت بھی ہے اور اِسی نسب سے پوٹھوہاری زبان کے ایک معروف شاعر پیر محمد شاہؒ کی قادرالکلامی کا اعتراف مرشدی ضمیر جعفری نے ان کے کلام کا اُردو میں ترجمہ کر کے کیا۔پیر جی نے ’’پیر دی ہیر‘‘ لکھ کر وارث شاہؒ کی شعری وراثت میں اضافہ کیا۔

ڈڈیال کے اُفق سے طلوع ہونے والے چودھری محمد یوسف اور چاچا علی محمد تا دیر سیاست کے آسماں پر جگمگاتے رہے۔حکیم مولوی محمد حیات علیؒ کی حکیمانہ شخصیت بھی ہفت پہلو حکمتوں کی حامل ہے۔سماجی خدمات کے میدان میں چاچا زمان علی وہ ستارہ

تھے جن کے سینے پر حکومت نے ستارہ خدمت سجایا۔

کپتان جلال خان جنہوں نے کھیل کی دنیا میں بھرپور جاہ وجلال دکھایا۔مختلف ممالک کو ہرایااور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرایا۔ ان کے علاوہ کئی بین الاقوامی کھلاڑی اور مقامی سیاست کا روقت کے کارخانے میں زیرِ کار ہیں جو مستقبل میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ اگر توصیفی سلسلہ یونہی بلا روک ٹوک چلتا چلا جائے تو اندر ہل کی مردم شناس سرزمیں نامور شخصیات سے بھری پڑی ہے لیکن ہمیں جنت میں داخلے کی جلدی پڑی ہے۔

اس وقت ہم کٹھاڑ سے گزر رہے ہیں۔ وقت کی رفتار سے بدلتی علاقائی شکلوں کی ایک تاریخی صورت یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ اس کا قدیمی نام کٹھاڑ مصراں تھا پھر صرف کٹھاڑ رہ گیا جیسے کوٹلی کا پہلا نام ''کوٹلی منگرالاں بیان کیا جاتا ہے کہ اسے منگرال راجپوتوں نے آباد کیا تھا لیکن اب صرف کوٹلی کہلاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کٹھاڑ ہندی زبان کے اُس کٹھار سے ماخوذ ہو جس کا مطلب پرانے دور کا وہ بڑا برتن ہے جس میں اناج ذخیرہ کیا جاتا تھا اور مصراں وہ قبیلہ ہو جس نے اسے آباد کیا ہو۔ پرانے وقتوں میں مصر ایک انتظامی عہدہ بھی رہا ہے۔

اسی طرح اب یہ قصبہ بھی کٹھاڑ دلاور خان کے نام سے موسوم ہے۔ بریگیڈئیر راجہ دلاور خان فوج میں وطن کی پاسداری کے بعد میرپور کے ترقیاتی ادارے کے چیئرمین کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں اور پوری ایمانداری سے اپنے لوگوں کی کما حقہٗ آبادکاری کر کے دھرتی سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں۔

کٹھاڑ کی سرزمیں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اسی کے خمیر سے ایک باضمیر

ماہرِ تعلیم، عصرِ حاضر کے ایک بڑے مفکر، جیّد عالم، ماہرِ اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان نے نمو پائی۔ موصوف نے لگ بھگ تیس کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ انہوں نے خطباتِ اقبالؒ جیسے ادق موضوع پر حیران کُن تحقیق فرمائی۔ ان کے اس کام کی سمجھ جب لوگوں کو آئے گی (جو اکثر دیر سے آتی ہے) تو وہ انگشتِ بدنداں رہ جائیں گے۔ اُن سے ہماری ارادت مندی کا تقاضا تھا کہ ان کے آستاں پر حاضری دی جائے۔ وہ ہنوز انگلستان میں ہیں چنانچہ آستانے پہ غائبانہ سلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کی اور ان کے سعادت مند بھتیجے سے دعوتِ طعام و کلام کا لطف بھی کشید کیا۔ راجہ شعیب عابد اپنے والدِ بزرگوار کی سیاسی روایت کو کمال خوبی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔

کشمیر کے زرخیز خطے نے نابغۂ روزگار شخصیات پیدا کیں۔ للہ عارفہ، حبّہ خاتون، غنی کاشمیری، چک بست اور مہجورؔ اسی دھرتی سے اُبھرے تو پھر کیا ہوا کہ وقت کے ساتھ یہ بانجھ ہوتی چلی گئی۔ دراصل اہلِ کشمیر میں بے شمار صلاحیتیں ہیں لیکن ایک علت بھی کہ وہ گوہر شناسی کے لئے بصیرت کے سمندر میں غوّاصی کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اگر کرتے بھی ہیں تو قدر شناسی سے عاری ہیں۔ یہ ''چراغ بیگ'' جیسوں کو باہر سے کاندھوں پر اٹھا لاتے ہیں لیکن اندر کے کئی دُرِّ نایاب ناقدر شناسی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ جو قابل جوہر کشمیر کی سرزمین سے باہر نکلا وہ شہرت کے آسمان کا ستارہ بن گیا۔

علامہ محمد اقبال، امام خمینی، پنڈت جواہر لعل نہرو، سرسید احمد خان، آغا حشر کاشمیری، خان عبدالقیوم خان، چراغ حسن حسرتؔ، عطاءاللہ شاہ بخاری، شورش کاشمیری، انور شاہ کاشمیری، مختار مسعود، قدرت اللہ شہاب اور نہ جانے کتنے اُن جیسے قابل لوگ نسلاً یا اصلاً اسی جنت نظیر کشمیر کے لالہ و گل تھے جن کی مہک سے گلستانِ جہاں تو مہکا لیکن کشمیر کی ویرانی نہ گئی۔

اس ویرانی پر ہماری پشیمانی تو واجب ہے پریشانی تو یہ ہے کہ ہمیں نہ تو سرخ پھولوں کی سرزمین کے خود رو پھولوں کی باغبانی کا قرینہ آیا اور نہ ہی وطن کی نگہبانی کا سلیقہ۔اگر تعفن کا خوف نہ ہوتو ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے ہم ایک جانب اُس پار کے کشمیر کی آزادی کے دعویدار ہیں اور اِس پار اقتدار کے لئے مصلحت کوشی کا شکار ہیں۔ ہم نہ تو آزادیٔ کشمیر میں خاطر خواہ پیش رفت کر پائے اور نہ ہی آزاد ریاست کو قبیلائی اور لسانی تعصّبات سے بچا پائے۔خیر جانے دیجیے، تلخ نوائی ہمارا مطمحِ نظر ہرگز نہیں ہے۔

پردۂ رمز و کنایہ نہیں مقصودِ ہنر
بات اگر کھل کے کہوں گا تو گراں گزرے گی

بات اتنی سی ہے کہ ہم نے بچے تو بے تحاشہ پیدا کیے لیکن وہ عطر بیز ماحول پیدا نہیں کر پائے جہاں انہیں اپنی بہار دکھلانے کا موقع میسر آئے۔ وسائل کی عدم دستیابی، علمی و ادبی ماحول کے فقدان، عصبیتوں اور کوتاہ فکریوں کے باعث ہمارے ہاں وہ مواقع میسر نہیں جہاں فکر و نظر کے پھول کِھل سکیں۔اس حوالے سے سیّدی ضمیر جعفری کا ایک شگفتہ واقعہ یاد آیا۔آپ بھی سن لیجیے، ثواب ہوگا۔

...مرشدی ہم سے بہت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے اور ہم اس بے جا عنایت کا اکثر ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے خواہ مخواہ بے باک ہو جاتے تھے، ایک روز فرمایا:

مراد! تم کشمیر چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟

عرض کیا**...** ’’کشمیر چھوڑ دو‘‘ کی اس تحریک کے محرکات بھی ارشاد فرما دیجئے!

فرمایا**...**تمہاری فنّی جولانیوں کی طغیانیوں کے لیے وہ زمین تنگ ہے۔

عرض کیا**...**آپ کے ارشاد کی تعمیل کے لیے فدوی کو سوچنے کی مہلت درکار ہے۔ایک سال گزر گیا۔

ایک دن ملاقات پہ دوبارہ ارشاد فرمایا:

مراد! ہماری مراد پوری نہیں ہوئی تم نے ابھی تک کشمیر سے ہجرت کا نہیں سوچا۔

عرض کیا:...جی بہت سوچا۔

فرمایا:...تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟

عرض کیا کہ آپ کا مشورہ ''برحق'' ہے، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کشمیر نے مجھے اُگل دیا ہو۔

وہ ہنستے ہوئے بولے...بھئی کیا خوب کہا، اُگل دیا ہے! تو پھر فی الفور وہاں سے چل پڑو...

بات آئی، گئی ہو گئی۔ ایک سال اور بیت گیا۔ ایک دفعہ انہیں پھر خیال آیا تو فرمایا:

...ہاں مراد! تم پچھلے سال کہہ رہے تھے کہ کشمیر نے تمہیں اُگل دیا ہے تو اب تک وہاں کیا کر رہے ہو؟

عرض کیا: مرشدی! اُگلے جانے کے بعد کے عمل سے گزر رہا ہوں...

فرمایا، وہ کیا؟

عرض کیا...گل سڑ رہا ہوں۔

اس پر وہ ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ واہ بھئی! کیا خوب کہا۔ بس اب جلدی کرو اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینک دے، تم خود ہی نکل لو۔

مُرشدی دنیا چھوڑ گئے، لیکن ہم کشمیر نہ چھوڑ پائے۔ اُن کی مراد پوری کرتے تو اور بامراد ٹھہرتے دراصل ان کی چشمِ بینا اس بات کا کامل ادراک رکھتی تھی کہ کشمیر میں تخلیق کار کے لئے ماحول سازگار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا تخلیق کار آج تک

پاکستانی تخلیقی دھارے میں شامل نہیں ہے۔اس بخل میں گروہ بندیوں کی جکڑ بندیوں کا دخل در نامعقولات بھی دخیل ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، کٹھاڑ، پچوانہ کی جنت کی سرحد پہ واقع ہے۔گویا اہلِ کٹھاڑ جنت کے پڑوسی ہیں۔ ہم دھیرے دھیرے جنت کے قریۂ شاداب کے قریں ہو رہے تھے۔خود رو پھولوں کی مہک جسم وجاں کو معطر کر رہی تھی اور خود اُگائے ثمر دار اشجار کی ثمر باری آنکھوں کو فرحت و تازگی سے ہمکنار کر رہی تھی۔ابھی چند دن پہلے پچوانہ کی سرحد پر شیطان نے ایک معصوم کلی مسل ڈالی۔کم سن کنول مطلوب نے اپنے شفق رنگ لہو کا خراج دے کر پچوانہ کی جنت میں شیطان کو داخل ہونے سے روک دیا۔

ایک تختۂ دیوار پر''مثالی معاشرہ پچوانہ''نوشتہ ہے۔''پچوانہ'' کا مطلب ہمارے خضرِراہ نے''پانچ راستے'' بتایا۔آزادی سے پہلے پانچ ہی ہوئے ہوں گے اب ایک رہ گیا ہے۔گماں ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ترقیٔ معکوس کا سفر شروع ہوا ہے۔

پچوانہ کے پیچ در پیچ راستے پر گاڑی قدرے محتاط چلاتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اگر حکومت کا رتھ کھینچنے والے، اس جنت نما بستی کے پانچ راستے بحال کرنے کی سکت نہیں رکھتے تو ایک دو رویہ کشادہ سڑک بنا کر مثالی گاؤں میں اپنی کارکردگی کی مثال ہی قائم کر لیتے، لیکن ان کی تو ہنوز عقل داڑھ ہی نہیں نکلی فقط دودھ کے دانت ہیں جو بس کھانے پینے کے ہی کام آتے ہیں۔

جنت نما یہ بستی ہری بھری اور شاداب ہے۔ یہ ہریالی جنت مکینوں کی رہینِ منت ہے جو اپنی مدد آپ کے تحت پودے لگاتے اور ان کی آبیاری کا ثوابِ دارین کماتے ہیں۔گویا ایک درخت لگاتے ہیں اور جنت میں گھر بناتے ہیں اور ہر گھر میں پندرہ قسم کے ثمر دار اشجار اُگاتے ہیں۔

مثالی معاشرے کے پہلے پڑاؤ کا پہلا گھر ''کتاب گھر''ہے،جس سے عیاں ہوتا ہے کہ اس معاشرے کی ترجیح اوّل فروغِ علم ہے اور ترجیح دوئم فلاح و بہبود، کہ کتب خانے کے ساتھ ایک مال خانہ ہے جس میں ضرورت کا سامان رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں سے ضرورت مند اپنی ضرورت کے مطابق لے جاتے ہیں۔معلوم نہیں کون رکھتا ہے،کون لے جاتا ہے؟ حاجت بھی پوری ہو جاتی ہے اور اَنا کا بھرم بھی رہ جاتا ہے۔ کتب خانے سے کتب کا آون جاون بھی اسی ڈھب سے جاری وساری ہے۔یہاں پر کتابی سرقہ بازوں کا داخلہ ممنوع ہے جو مستعار کتاب کا ادھار کبھی نہیں چکاتے،امانت کے طور پر جو کتاب لے جاتا ہے وہ مطالعے کے بعد پوری دیانت اور شرافت سے واپس وہیں پہ رکھ جاتا ہے۔

اس سے آگے باغِ عدن کا در کھلتا ہے۔خدائی جنت کے دروازے پر ایک درباں فرشتے قبلہ رضواں کا ذکر ملتا ہے،جس سے غالبؔ نے اپنی افتادِطبع کے طفیل متوقع لڑائی کا خدشہ بھی ظاہر کیا تھا:

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

مگر پچوانہ کی جنت کے دروازے پر رضواں کے بجائے ہمارے میزباں، شادماں، لبِ خنداں پھولوں کے نورستہ گلدستے اور ہار تھامے ہمارا رستہ دیکھ رہے ہیں۔ لاریب نیک لوگوں کا جنت میں اسی چھب سے استقبال ہوتا ہوگا۔ہم اگرچہ اتنے نیکوکار ہرگز نہیں ہیں تاہم ریہرسل کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ چنانچہ آگے بڑھ کر سرِتسلیم خم کیا ۔ان محبت شناس، نیک فطرت افراد نے نہ صرف ہار ہمارے گلے میں ڈالے بلکہ ہمیں بھی گلے سے لگا کر وہ محبت منتقل کرنے کی جسمانی کوشش کی جو ان کی سرشت میں روحانی طور

پر شامل ہو چکی ہے۔ ہر چہرہ چاہت سے لبریز، ہر آنکھ محبت سے پُرنور گویا نورٌ علیٰ نور!

مثالی معاشرے کی اس سلطنت میں کوئی بادشاہ ہے نہ رعایا، کوئی راجہ ہے نہ پرجا، کوئی حاکم ہے نہ محکوم سب آزاد ہیں اور زندگی کا کاروبار کسی انجانے خودکار نظام کے تحت تیز رفتار چل رہا ہے۔ اس برق رفتاری سے واضح ہوتا ہے کہ ہر آدمی نے اپنی ذمہ داری پوری ایمان داری سے قبول کر رکھی ہے۔

ایک بڑے سے سدا بہار اور چھتنار برگد کے نیچے ہماری نشستوں کا اہتمام ہے۔ یہ درخت سات رنگوں سے مزیّن ہے۔ رنگوں کی یہ رنگا رنگی جہاں دھنک رنگ خیالات و جذبات کی وسعتوں کی عکاس ہے وہاں مختلف قبائل اور مختلف نظریات کے حامل لوگوں کے باہمی اتحاد و یگانگت کی غماز بھی ہے۔ اس برگد کی چھاؤں میں بلا تفریق رنگ و نسل ہم ایک ہیں کا نعرۂ برادرانہ بلند کر کے سب دوستانہ طریقے سے بیٹھ جاتے ہیں، گویا:

ایک ہی صف میں ''بیٹھ گئے'' محمود و ایاز!

برگد کی دوسری سمت ایک اونچا چبوترا ہے، جہاں کم سن پھول اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے لباس پہنے، چھیل چھبیلے انداز میں قطار اندر قطار بیٹھے ہیں۔ یہ نو عمر بچے لاشعوری طور پر تربیت کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ بڑے ہو کر یہی باکمال بچے اس مثالی معاشرے کو بے مثال معاشرے کی لازوال منزل دکھائیں گے اور نسل در نسل فلاح پائیں گے۔ باہمی یگانگت کا جذبہ جب انسانی فطرت کا حصہ بن جائے تو معاشرے میں اتفاق و اتحاد کی اٹوٹ زنجیر خود بخود بنتی چلی جاتی ہے۔ ہم چشمِ تصوّر سے چبوترے پر کڑی در کڑی ایسی ہی ایک لازوال زنجیر بنتے دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں اس جنت نما معاشرے کے بانیوں کی دانش کو داد دے رہے ہیں جنھوں نے ان نونہالوں کی لاشعوری

تربیت کا ایک شعوری قرینہ دریافت کیا ہے۔

اس جنت کی آبادکاری کی جانکاری ہمارے راجہ خضر المعروف امتیاز حسین راجہ کے مَن میں سمائی۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی بغیر نظریے کے ایسے ہی ہے جیسے بِنا تیل کے چراغ اور وہ لوگوں کو اس بات پر مائل کر رہے ہیں کہ علم صرف کتابیں رٹنے کا نام نہیں بلکہ اس مہارت اور تکنیک کا نام ہے جس کی بدولت جنت سے نکالا ہوا آدم زمین پر دوبارہ ایک نئی جنت تعمیر کرے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جانکاری کے اس منصوبے کی مزید گل کاری کی خاطر اہلِ پچوانہ کی ایک محفل سجائی اور ان کے سامنے مثالی معاشرے کی تجویز رکھ دی۔

سب نے تہ دل و جاں قبول کی، زمیں پہ جنّت بسانے کے خواب کو عملی صورت دینے میں تمام اہلِ پچوانہ کی پشت بانی شامل ہے۔ اس کی نگہبانی بحیثیت صدر علی الترتیب ظفر اقبال، اُلفت خان، پروفیسر عنصر علی خان اور نجابت حسین کے حصے میں آئی۔ مثالی معاشرے کے تاسیسی منتظمین میں سے ظفر اقبال، شوکت خان اور حسن علی پچوانہ کی جنت کو چھوڑ کر اللہ میاں کے ہاں جنت مکانی ہو گئے تو ان کے پسماندگان شعیب ظفر، چنگیز خان اور وقاص علی کی صورت میں یہ خواب دوسری نسل میں ڈھل گیا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور جذبے فرد سے افراد میں منتقل ہوتے ہیں۔ یوں ایک ایک کر کے یہ کارواں بنتا چلا جاتا ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس وقت ہمارے سامنے وسیع میدان ہے، جہاں لوگ باہم محبت کے انسانی رشتوں میں پیوست ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کو آگے بڑھنے

میں بلا معاوضہ مدد کی سہولت فراہم کر رہا ہے۔ اخوت و باہمی تعاون کا باوقار، شاندار اور جاندار ماحول کسی ایمان دار جنتی معاشرے میں ہی ممکن ہے جبکہ ہمارے داغدار، نانہجار اور نابکار جہنمی معاشرے میں دوسروں کو پیچھے ہٹانے اور نیچے گرانے میں حتی المقدور جبری امداد مہیا کی جاتی ہے اور اس کام کی مشقت طلب انجام دہی کے بعد معاوضہ طلب نگاہوں سے تاڑا جاتا ہے گویا نقصان کر کے احسان فرمایا، اب ایسوں سے کون کہے کہ:

یہ احساں جو نہ کرتے تو احساں ہوتا

اس کے برعکس ''پچوانہ کی جنت'' میں ہر آدمی اپنے کام میں دل وجاں سے مگن ہے، لیکن اس کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا کہ وہ اسے مزدوری نہیں جانتا بلکہ مثالی معاشرے کے فروغ کے لیے ضروری مانتا ہے۔ اگر یہ مزدوری ہے بھی، تو اس کی اُجرت محبت ہے، جس کی نہریں یہاں روانی اور فروانی کے ساتھ بہتی ہیں اور ہر طالب اپنی طلب کے مطابق سیراب ہوتا ہے۔

اُدھر طعام کا انصرام ہو رہا ہے تو اِدھر برگد کے نیچے'' مکالمہ'' شروع ہو چکا ہے۔ ہر ایک برابری کی سطح پر اظہار رائے کا حق رکھتا ہے۔ اس کی گفتگو سے کسی کی پیشانی پر شکن نہیں آتی کہ یہ لوگ مکالمے کو مثالی معاشرے کا لازمہ گردانتے ہیں۔ جملہ تنازعے مکالمے سے طے پاتے ہیں اور مکالمے کا اختتام معافی پر منتج ہوتا ہے۔ گویا مثالی معاشرے نے امن و آشتی کا بڑا راز پا لیا ہے۔ مکالمے کے آغاز سے ہی انسان نے زبان کا استعمال سیکھا۔

معافی مانگنا اور معاف کرنا دونوں مشکل کام ہیں جس کے لیے درکار عزم وحوصلے کی ہمت ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہوتی لیکن پچوانہ کے باشعور اور باہمت لوگوں نے اس غیر معمولی ہنر پر دسترس حاصل کر لی ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جس کی روایت کہیں

سقراط کے ہاں ملتی ہے۔ دوسروں کی بات تحمل سے سنی جائے اور اپنی بات متانت سے کہی جائے ۔سقراط نے یہ حکمت اپنے گھریلو حاکم سے سیکھی ۔ یہ بے مثل فلسفی ظاہری خوبصورتی سے خالی اور باطنی دانائی سے بھرا پڑا تھا جبکہ موصوف کی نصف بہتر کچھ زیادہ بہتر نہ تھیں ،وہ صرف بدصورت ہی نہیں بلکہ بدمزاج بھی تھیں۔آتے جاتے سقراط کو بے عزت کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھیں۔ایک مرتبہ کسی شاگرد نے کہا بھی کہ:

...قبلہ آپ کو بیگم صاحبہ اتنا سخت سست کہتی ہیں لیکن آپ انہیں کچھ نہیں کہتے ؟

سقراط نے بڑے تحمل سے جواب دیا:

...میاں! اُنہیں کچھ مت کہو،جس طرح میں تمہارا اُستاد ہوں وہ میری اُستاد ہیں۔

شاگرد نے حیران ہو کر پوچھا:

آپ نے اُن سے کیا سیکھا ہے؟

سقراط بولے:

میں نے اُن سے صبر و برداشت اور تحمل سیکھا ہے۔

برداشت، تحمل اور صبر کی رِیت اگر پنپ جائے تو ہم ایک پُرامن معاشرے کی جانب تیزی سے پیش قدمی کرنے لگیں۔ پچوانہ کے مثالی معاشرے میں یہ رِیت رواج بن کر پنپنے لگی ہے۔آج بھی اس اکٹھ میں وہ نیک دل، بلند حوصلہ، باجرأت اور قابلِ تقلید لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنے درمیان شدید رنجشوں کو بھی عفو و درگزر کا تاجِ فضلیت پہنا کر مثالی معاشرے کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔

ہم نے ذوقِ آوارگی میں پاکستان کا قریہ قریہ،نگر نگر چھان مارا رِیت رواج کا مشاہدہ کیا اور حاصل مشاہدہ و مجاہدہ کی صورت سفری مزاح پر مبنی ایک کتاب ''صفر نامہ'' چھاپ دی۔ہمیں پورے پاکستان میں پچوانہ جیسا مثالی معاشرہ کہیں نظر نہیں آیا ماسوائے

اس ایک جھلک کے جو ہمیں ہنزہ میں دکھائی دی ۔ ہماری گاڑی کا پہیہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ پنکچر والے نے نہایت مؤدب انداز میں ہمارا استقبال کیا اور بلا تاخیر ناکارہ پہیے کی مرمت میں مصروف ہو گیا ۔ وہ نہایت انہاک اور سرعت سے کام کر رہا تھا جبکہ ہمارے ہمراہی زیادہ جلدی میں اُدھم مچا رہے تھے اور جلد باز ایسے کہ جلد ہی گالم گلوچ پر اُتر آئے۔ ہم نے مداخلت کر کے معرکۂ باطل روکنے کی سعی کی ۔ ابھی تک وہ شخص مٹی کے بُت کی طرح خاموش ہمارے ہمراہی کی مغلظات سن رہا تھا ۔ ہمیں کمک پہ آتے دیکھ کر بڑے تحمل سے مخاطب ہوا:

اپنے دوست کو منع کیجیے کہ یہ ہمیں گالیاں نہ دیں۔ ہم نہ تو گالی کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ جھگڑا کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے مسلک میں ایسا کرنا سختی سے منع ہے ۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ آپ کے دوست کا بلڈ پریشر خراب ہو جائے گا اور یہ بیمار پڑ جائے گا ۔

آپ اندازہ کیجیے کہ ایک عام سطح کے آدمی کی اخلاقی سطح کتنی بلند تھی کہ وہ بلا وجہ گالیاں بکنے والے اجنبی کی صحت کے لیے بھی فکر مند تھا خیر یہ اُن کا مسلکی رویہ ہے جبکہ پچوانہ کے مثالی معاشرے میں یہ رویہ کسی ایک مسلک یا کسی خاص نظریئے کا محتاج نہیں ۔ یہ انسانی سطح پر پہنچنے والا وہ مثالی رویہ ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی ۔

پچوانہ کا مثالی معاشرہ مکالمے کی اساس پر قائم ہے ،جس سے ہر بات کا حل نکل سکتا ہے۔ مکالمے کی اولین باقاعدہ صورت گری ربّ کائنات کے فرشتوں سے خطاب کی صورت ہمارے سامنے آتی ہے جب وہ اپنی نورانی مخلوق کو خاکی مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم فرماتا ہے۔ سب نے خدائی حکمت کی حاکمیت کو تسلیم کیا سوائے ابلیس کے، جسے اپنی دانش کا غرور تھا ۔ اگر وہ تحمل ، برداشت اور اِنکساری سے مکالمہ سنتا تو یوں

راندۂ درگاہ نہ ہوتا۔ زمیں کی در بدری کی بجائے آسمانوں پر اُڑتا پھرتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اَنا آڑے آجاتی ہے وہاں مکالمے کی روح فنا ہوجاتی ہے۔

مکالمے کی اساس پر سقراط نے قدیم یونانی تہذیب استوار کی، اسی مکالمے کی راہ پر بعد میں ''جان لاک'' نے یورپی تہذیب ہموار کی جبکہ مکالمے سے دوری کی بنا پر ہم نے اپنی تہذیب باہمی فتنہ وفساد سے دوچار کی۔ اگر ہم پچوانہ کے اس مثالی معاشرے کو ایک مثال بنا کر اپنے ملک میں مکالمے کو رواج دیں تو کامل یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا پورا ملک مثالی معاشرے میں ڈھل سکتا ہے اور اگر انہی بنیادوں پر ہم عالمی سطح پر ایک دوسرے سے ہم کلام ہوں تو ایک ایسا پُرامن عالمی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے جسے ہم بلا تامّل زمیں پر جنت کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

مکالمہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب ہم دوسرے کی درست بات کو تسلیم کریں اور اس کی تعظیم میں اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں۔ آدمی خطا کا پُتلا ہے، اُس سے غلطیاں سرزد ہونا ایک فطری بات ہے۔ اگر غلطی تسلیم کرلے تو اس کا سفرِ انسانیت آسان ہوجاتا ہے لیکن بعض اوقات ہم غلطی تسلیم نہ کر کے ایک نئے جھگڑے کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ تو نہایت سوچ سمجھ کر غلطیاں کرتے ہیں اور ان کو پردۂ اخفا میں سنبھال، سنبھال رکھتے ہیں کہ کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔ اگر کوئی ان کی غلطی پکڑتا ہے تو وہ اس کا گریبان پکڑ لیتے ہیں۔

بزرگوں کی غلطیاں پکڑنا تو اور بھی مشکل کام ہے کہ اس کے پیچھے صدیوں کا تجربہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ غلطیاں اتنی پاکیزہ و برگزیدہ ہوتی ہیں کہ وہ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔ اگر کوئی ناہنجار انہیں پکڑنے کی جسارت کرے تو وہ مہارت کا لٹھ لے کر اس وقت تک پیچھے پڑے رہتے ہیں جب تک اپنی غلطی چھڑا نہیں لیتے شاید اسی

لیے کہا جاتا ہے کہ:

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

آج ہم پچوانہ کے مثالی معاشرے کو دیکھ کر اپنی ایک سنگین غلطی کا اعتراف بھی کیے دیتے ہیں۔ کالج کا زمانہ تھا، ڈگری کالج کوٹلی میں پروفیسر سرور ملک نے ڈانٹ پلا کر ہمیں جماعت سے بے دخل کیا تو ہماری اَنا سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ ذہن کے کسی خانے میں شاید یہ فتور بھی مستور تھا کہ "پدرم سلطان بود" اور فی الوقت بھی ابا حضور ضلعی حاکم کے عہدے پر مامور تھے پس پروفیسر صاحب کو باہر آنے کی دھمکی دے کر نکل پڑے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طلبا کی سیاست نے تعلیمی اداروں کا ماحول اتنا مکدر کر دیا تھا کہ طالبِ علم باقاعدہ مسلح ہو کے کالج آتے جاتے تھے۔ ہم بھی اسی حالت کی نخالت میں مبتلا تھے۔ نجانے کون سا سانحہ ہو جاتا لیکن پروفیسر صاحب کی عظمت دیکھیے کہ لیکچر کے بعد فوراً ہمارے پاس آئے، ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے بولے، عزیزی! اس وقت آپ غصے میں ہیں لیکن ذرا تحمل سے سوچیے کہ غلطی کس کی ہے؟ اگر غلطی آپ کی ہے تو آپ معافی مانگ لیں، اگر ہماری ہے تو ہم مانگ لیتے ہیں تاہم یہ یاد رہے کہ غلطی تسلیم کرنے والا عظیم ہوتا ہے۔

اُس وقت ہم میں اتنی عقل تو نہیں تھی شاید عظمت کی پھونک میں آ گئے اور فوراً معذرت کر لی لیکن جب بعد میں احساس ہوا کہ اس ایک معذرت نے ہمیں نہ صرف ایک نادیدہ سانحے سے بچا لیا بلکہ عمر بھر کا درس بھی دیا کہ اماّ بعد ہمیں کبھی بھی کسی کے سامنے اپنی غلطی کی معذرت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، نوبت بایں جا رسید کہ ہم اپنی غلطی پر بچوں سے بھی معذرت کرتے پھرتے ہیں۔ آج پچوانہ کے اس مثالی معاشرے کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اس بات پہ راسخ ہوں کہ معافی مانگنے سے نہ صرف عظمت ملتی ہے بلکہ

معاشرے میں جنت جیسا ماحول بھی پیدا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے آقا (ﷺ) نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرما دیا۔

پچوانہ کے مثالی معاشرے میں ہر پیر و جواں اس بات پر متفق و متحد ہے کہ غلطی کی معافی مانگ لینے اور معاف کر دینے میں ہی انسان کی عظمت ہے۔انھیں یقین ہے کہ انسان نام ونسب، ذات پات یا کسی عہدے سے نہیں بلکہ کردار سے بڑا بنتا ہے۔اس طرح یہ یقیناً بڑے لوگ ہیں جو چھوٹوں کو بڑا ہونے کا عملی درس دے رہے ہیں ۔ یوں پچوانہ کا یہ مثالی معاشرہ جملہ عوام الناس کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔

یہ سبق اُن سیاست کاروں کے لئے بھی ہے جو آپس میں لڑائی کا فقط ڈرامہ رچاتے ہیں اور سادہ لوح عوام کو سچ مچ میں ایک دوسرے سے لڑا دیتے ہیں ۔عوام کہنا بھی لوگوں کی توہین ہے کہ عوام کا مطلب لغت میں نہایت عامیانہ سا ہے لیکن یہ بے چارے قائدین لغت کب پڑھتے ہیں بس لڑتے ہیں۔لڑائی سر پر اس قدر سوار کہ انتخاب میں حصہ لینے کو بھی الیکشن لڑنا کہتے ہیں۔ سیاستدانوں کو اگر امن و بھائی چارے کے ساتھ امانت، دیانت ، شرافت اور صداقت کا سبق پڑھنا ہے تو نفرت کی روش ترک کر کے پچوانہ کی راہ لیں اور اس مثالی معاشرے کے لوگوں کے آگے زانوئے تلمذ ٹیک دیں۔یہ سبق ہمارے ان حکمرانوں کے لئے بھی ہے جو مثالی نظام کے قیام کے دعوے کرتے پھرتے ہیں اور مغربی معاشرے کی مثالیں بیان کرتے نہیں تھکتے ۔انہیں پچوانہ کے معاشرے کا مطالعہ کرنا چاہیے اگر وہ واقعی ملک کو پُرامن اور خوش حال بنانے کے خواہشمند ہیں لیکن ہمارے مولانا غیرآبادی فرماتے ہیں کہ بدامنی اور بدحالی میں سیاستدانوں اور حکمرانوں کی خوش حالی پوشیدہ ہے۔

یہ سبق عمرانیات کے طلبا کے لیے بھی ہے کہ وہ اس پہ تحقیق کریں کہ وہ کون سے

اجزائے ترکیبی ہیں جن کی جڑت سے ایک مثالی معاشرہ عملی طور پر تشکیل پاتا ہے جس کی تھیوری وہ صدیوں سے رٹ رہے ہیں ۔تحلیلِ نفسی کے عمل سے گزرے ان لوگوں سے ملاقات ،ماہرینِ نفسیات کے لیے لائقِ تسکین ہو گی کہ کس طرح خیالات ،نظریات، احساسات، جذبات اور شخصیات کے تضادات ہم آہنگ ہو کر مثالی معاشرے میں تحلیل ہو رہے ہیں ۔

پچوانہ کے مثالی معاشرے کا ہر شخص معاشرے کے فروغ میں مثالی کردار ادا کر رہا ہے اور اس کے اس بے مثال کردار کو برابر سراہا بھی جا رہا ہے۔اس نشست میں مثالی معاشرے کے لیے سب سے زیادہ مدد و معاون ،صلح جو اور امن پسند بزرگ شخصیت محمد غیاث خان کو ایوارڈ دیا گیا۔ایک ایوارڈ چتر پڑی کے جہانگیر اقبال کے حصے میں بھی آیا کہ جنھوں نے اس جنت میں زمیں سے نہر نکالنے کا بندوبست کیا ہے۔اوّل الذکر کو ایوارڑ ہمارے اور آخر الذکر کو اسلم لون صاحب کے ہاتھوں دلوایا گیا۔یہ ایوارڈ ایسے کام پہ ملتا ہے جس سے مثالی معاشرے کے ارتقا کو مہمیز ملے ۔مثال کے طور پر ایک خاتون محترمہ شمیم اختر کو اس بنیاد پہ ایوارڈ دیا گیا کہ وہ اس مثالی گاؤں کی مثالی مہمان نواز خاتون ہیں جنہیں قدیمی تہذیب کی خوشبو سے رچی بسی وادئ مہران کے مہمان، محبتوں کے قدردان ڈاکٹر امیر احمد شیخ نے ایوارڈ دیا۔حسن اتفاق سے وہ آزاد کشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس ہیں جو اپنی خواہش و چاہت سے مثالی معاشرے کو دیکھنے آئے اور اس کی قدردانی اپنی زبانی کچھ یوں کی کہ ”میں زندگی میں دو بار حیران ہوا ایک بار جب میں نے پیرس دیکھا اور دوسری بار جب میں نے پچوانہ کا مثالی معاشرہ دیکھا۔“

آئی جی پولیس خود تو حیران ہوئے ،لوگوں کو بھی حیران و پریشان کیا۔حیرانی اس بات کی کہ سندھ سے پولیس کے سربراہ ہمارے پاس آتے ہیں اور آس پاس کی

ناسپاس حکومتی اشرافیہ قدم رنجہ نہیں فرماتی حالانکہ پچوانہ کا مثالی معاشرہ وہ ماڈل ہے جس کے قیام کے لیے وہ سرکاری خزانے سے لاکھوں روپے تنخواہ کی مد میں سرکاتے ہیں ، موج اڑاتے ہیں اور راگ درباری میں گاتے ہیں :

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست !

عام طور پر پولیس برائی کے تعاقب میں چھاپے مارتی پھرتی ہے لیکن اُن کے آئی جی اچھائی کو تلاش کرتے پچوانہ آئے اور اسے خوب سراہا ۔ اسی طرح اگر اچھائی کو سراہنے کا عمل شروع ہو جائے تو برائی خود بخود مٹتی چلی جائے ۔ یہ فرض میڈیا کا ہے کہ وہ اچھائی کی تشہیر کرے، شاید اسی فرض کی پکار پر ہمارے دوست اور سینئر صحافی ساجد یوسف برطانیہ سے اپنے احباب کے ساتھ کھنچے چلے آئے اور اس مثالی معاشرے کے لیے اپنی محبت کا خراج قلم و قرطاس کے ذریعے پیش کیا۔ صحافتی ایوانوں سے مثالی معاشرے کا چرچا آستانوں تک پہنچا تو معروف گدی نشین پیر عمر زیب قاسمی موہڑہ شریف سے دُعا کرنے چلے آئے ۔

دو بزرگ خواتین زیتون بیگم اور کریم بیگم کو امن ایوارڈ پیش کیے گئے کہ انھوں نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ ہمارے معاشرہ میں کسی خاتون کا جھگڑا نہ کرنا ناممکن سی بات ہے لیکن ہر دو بہادر خواتین نے یہ ناممکن کام بھی ممکن کر دکھایا۔

نظام ثقہ کا ایک روزہ بادشاہی نظام تو ایک روایت ہے لیکن پچوانہ کی اس مثالی ریاست میں فی الواقع ایک دن کی حکمرانی خواتین کے حصے میں بھی آتی ہے ۔ یہ شاید دنیا کا ایک انوکھا تجربہ ہے کہ مادر سری نظام کے ہزاروں صدیوں بعد عورت راج کا یک روزہ تاج خواتین کو پہنایا جاتا ہے ۔ اُس دن گھریلو خدمت کا تمام انصرام اور طعام کا اہتمام مرد حضرات اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں اور خواتین کو احترام سے کھلاتے ، پلاتے اور انہیں

برابری کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

بیرونِ ملک لوگ جہاں ملکی معیشت کے گلشن میں زرِمبادلہ کی آبیاری کی ذمہ داری ایمان داری سے کر رہے ہیں وہاں پچوانہ کی جنت کی آبادکاری کے لیے بھی مالی اعانت کر رہے ہیں۔ یہ انگلستان اور دیگر ممالک میں موجود احباب کی محبت کا اعجاز ہے کہ اس جنتِ ارضی کی تزئین و آرائش کا سامان ہو رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی عظمت ہے کہ سات سمندر پار سے زرِمبادلہ کی صورت سوغات بھیجتے ہیں اور سماجی بہبود کے امور میں شرکت کرتے ہیں۔

پچوانہ کی جنت کے باسیوں کی زندگی کا یا کلپ ہوگئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول چکے ہیں کہ ہم میں سے کون کس قبیلے کا ہے؟ اور ماضی میں کس نے، کس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو واقعی آ گئی ہے۔

ہر ماہانہ نشست کے اختتام پر حساب کتاب کا دفتر بھی کھلتا ہے، گویا یہ یومِ حساب بھی ہوتا ہے جس میں ایک ایک عمل کا اعمال نامہ پیش کیا جاتا ہے اگر ہمارے روزمرہ کے معاملات میں اس طرح کی خوداحتسابی پیدا ہو جائے اور مثالی معاشرے کی معاشرت زندگیوں میں گھر کر لے تو یہ دنیا ہی جنت بن جائے۔

صاحبو! خدائی جنّت تو کہیں آسمانوں پر ہے جس کے وصال کے لیے دنیا سے انتقال کرنا پڑتا ہے تاہم ''پچوانہ کی جنتِ ارضی'' میں آپ زندہ حالت میں بھی جا سکتے ہیں، جس کا راستہ ہم نے آپ کو مفت میں بتا دیا ہے۔ اب آپ میں سے ہر عاقل بالغ مومن پر واجب ہے کہ وہ پچوانہ کی اس ارضی جنّت کی زیارت کرے اور اگر توفیق ہو تو اپنے اپنے علاقے میں ایسی ہی ایک، ایک جنّت آباد کرے، عین ممکن ہے کہ آپ کے اسی عمل کے عوض ربِّ کائنات اپنی ابدی جنّت میں آپ کو جگہ عطا فرما دے۔

کوٹلی
میرپور
دینہ
پلاک پل
ڈڈیال
سنٹرل کراس
پچوانہ
ڈھان گلی پل
کلر سیداں
روات
راولپنڈی